

صبر اور نفسیاتی کیفیات

خرم مرادؒ

(آخری قسط)

روزمرہ زندگی میں انسان کو جو بھی رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں ان کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک مادی رکاوٹیں اور دوسری نفسیاتی رکاوٹیں۔

مادی رکاوٹوں کے کئی پہلو ہیں۔ کوئی مشکل پڑ جائے، کوئی نقصان ہو جائے، کوئی بڑی خواہش پوری نہ ہو اور کوئی لالچ بھی ہو سکتا ہے۔ جب ہم رکاوٹ کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قسم کی مزاحمت ہوگی۔ کوئی بھی شے اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ کسی بھی چیز کی کشش ہو سکتی ہے۔ یہ وہ مادی رکاوٹیں ہیں جن کا تعلق آدمی کے جسم و جان اور مال سے ہے۔

دوسری قسم کی رکاوٹیں نفسیاتی ہیں۔ ان کی جڑ آدمی کے اپنے اندر اس کے نفس کے اندر اور اس کے دل و دماغ کے اندر ہوتی ہے۔ یہاں جو چیزیں اٹھتی ہیں وہ اس کو راستے سے ہٹاتی ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں اس کو ترغیب دیتی ہیں اس کے اندر خواہشات پیدا کرتی ہیں اور وسوسہ ڈالتی ہیں۔ یہ رکاوٹیں اس طرح کی ہو سکتی ہیں کہ: ایسا کرو گے تو یہ ہو جائے گا، جیب سے پیسہ نکالو گے تو تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا اور تم فقیر اور نادار ہو جاؤ گے، لہذا جیب مت کھولو۔ یہ سارے وسوسے جو اندر سے پیدا ہوتے ہیں یہ نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو فی الواقع اصل چیز وہی ہے جو آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، لہذا اصل رکاوٹیں نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔ مادی مصائب مادی ترغیبات اور مادی رکاوٹوں کی بھی اصل جڑ آدمی کے نفس کے اندر ہوتی ہے۔ اگر کسی کو ڈھیر سا مال مل جائے اس کی نظر میں اس مال کی قیمت پتھر کے چندریڑوں سے زیادہ نہیں ہوگی، اگر اس کا نقطہ نظر صحیح ہو۔ اگر اس کو موت کے منہ میں جانا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ موت نہیں ہے بلکہ یہ تو جنت اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا نام ہے، تو موت کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا۔ بڑی سے بڑی چوٹ آدمی کو لگتی ہے مگر اپنے

اندر کے حوصلے سے اپنے اندر کی نفسیاتی کیفیات سے وہ اسے سہارا جاتا ہے۔ دوسری طرف ذرا سی مصیبت پڑتی ہے تو آدمی ہمت ہار دیتا ہے اور رونا دھونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا تعلق مصیبت کی مقدار یا آزمائش کی نوعیت سے نہیں ہے کہ آدمی کو کس چیز کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ اس کا تعلق اس کے ذہن سے ہے۔ دراصل طاقت کا سرچشمہ انسانی ذہن کے اندر پوشیدہ ہے۔

یہ انسانی سوچ اور جذبہ یا نفسیاتی کیفیت ہی ہے جو اسے دلیر نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے یا خوف اور ڈر سے پست ہمت یا بزدل۔ ایک کیفیت کے تحت وہ بڑا طاقت ور بن جاتا ہے۔ ایک ایک سپاہی سوسو سپاہیوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے اگرچہ مادی و عسکری لحاظ سے وہ مقابلتاً کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے پاس زیادہ مادی طاقت ہے بلکہ اس کی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جو اسے نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ ہمارے اوپر مصیبت پڑ سکتی ہے یہ ایک دوسری نفسیاتی کیفیت ہے جو ایک فرد کی طاقت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ بہت سے وسائل رکھنے کے باوجود اور بہت کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کا متحمل ہونے کے باوجود حوصلہ و ہمت ہار دیتا ہے اور عملاً ناکامی و شکست سے دوچار ہو کر رہتا ہے۔

خوف اور حزن

اگر غور کریں تو ہم ان تمام نفسیاتی کیفیات کا دو حوالوں سے جائزہ لے سکتے ہیں: ایک خوف اور دوسرا

حزن۔

خوف کے معنی ہیں ڈر یا اندیشہ کہ کچھ ہو جائے گا جو ملنے والا ہے وہ نہیں ملے گا یا کوئی ایسی چیز مل جائے گی جو ناخوش گوار اور ناقابل برداشت ہوگی اور نقصان کا باعث ہوگی۔

حزن سے مراد اس بات کا غم کہ کچھ چھن گیا یا نقصان ہو گیا، کوئی ضرب پڑ گئی، کوئی چیز ملنا چاہیے تھی نہ ملی اور جو چیز نہ ملنا چاہیے تھی وہ مل گئی۔ غم کی اس کیفیت کو حزن و ملال کہا جاتا ہے۔

دراصل نفس کے اندر کی یہ وہ کیفیات ہیں جن سے اصل رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آدمی خوف اور اندیشوں پر پہلے سے قابو نہ پائے تو جن چیزوں کا خوف و اندیشہ اس کو لاحق رہتا ہے وہ اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ خدشات کہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ ہو جائے گا، ایک چیز جو ہاتھ لگنے والی ہے اگر ہاتھ نہ لگی تو یہ بڑا نقصان ہو جائے گا، میری عزت کو میری دولت کو معاشرے میں میرے مقام و مرتبے کو نقصان پہنچ سکتا ہے، سیاسی مادی مالی یا جو کچھ بھی حیثیت ہے، ہاتھ سے نکل جائے گی۔ یہ خوف و خدشات جب آدمی کے اوپر طاری ہوتے ہیں تو پھر بالآخر وہ ان کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

دوسرا پہلا غم اور حزن کا ہے، یعنی یہ کہ جو چیز حاصل تھی وہ ہاتھ سے نکل گئی، کوئی مر گیا یا مال کا نقصان ہو گیا،

یا کسی نے عزت کے اوپر حملہ کر دیا، گالی دے دی وغیرہ۔ جب کوئی نقصان ہو جاتا ہے یا عزت تک ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو آدمی کو اس کا غم ہوتا ہے۔ غم ہو تو پھر غصہ بھی آتا ہے۔ غم و غصہ کا لفظ تو ہماری زبان میں اردو ادب میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں غم پیدا ہوتا ہے وہاں غصہ بھی لازماً آتا ہے، کہ یہ چیز کیوں ہمارے ہاتھ سے نکل گئی، میری عزت پہ یہ حملہ کیوں ہو گیا، جو چیز مجھے ملنے والی تھی وہ کیوں کوئی چھین کے لے گیا۔ اس طرح ایک طرف تو غم ہوتا ہے جو غصے کے اندر تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر غصہ بالآخر اشتعال دلاتا ہے اور اس اقدام پر مجبور کرتا ہے جو صبر کے منافی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں نیک بندوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی اس صفت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ نہ خوف اور اندیشے کا شکار ہوں گے اور نہ کسی غم کے اندر مبتلا ہوں گے۔ جنت کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ **فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (البقرہ ۲: ۳۸) یعنی جنت کی زندگی کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ وہاں نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی چیز کے چھٹنے کا خدشہ ہوگا۔ کوئی مصیبت پڑنے کا خوف بھی دل کے اوپر طاری نہیں ہوگا اور نہ کوئی چیز ہاتھ سے نکل جانے کا غم و غصہ ہوگا بلکہ اطمینان ہوگا کہ صحیح زندگی گزار آئے اور صلہ پالیا۔ کوئی حسرت نہیں ہوگی کہ یہ کام کیوں نہیں کیا اور اگر یہ کرتے تو یہ پیش نہ آتا۔ اگر غور کیا جائے تو دراصل یہی دو چیزیں ہیں جو صبر کے سرچشمے کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں اور صبر کے راستے میں جو چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں ان کا اظہار بھی انہی دو باتوں سے ہوتا ہے یعنی خوف اور حزن۔

مختلف نفسیاتی کیفیات

اگر اس بات کو مزید واضح کیا جائے تو یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ جو نفسیاتی کیفیات انسان کے اوپر طاری ہوتی ہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی طاری ہوا کرتی تھیں۔ یہ مسلمانوں کے اوپر بھی طاری ہوا کرتی تھیں۔ ان کیفیات کو قرآن مجید نے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اگر ہم ان میں سے ایک ایک چیز کو دیکھیں تو اس کے اندر ہمارے لیے سبق اور فصاحت کا بہت بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ میں جسمانی و مادی مصائب کا ذکر نہیں کر رہا، یعنی جو مار پیٹ ہوئی، جو جانیں دینا پڑیں، جو محنت کرنا پڑی، اور جان و مال کا جو نقصان ہوا، اس لیے کہ اس کی جڑ بھی نفسیاتی رکاوٹوں کے اندر ہے۔ دراصل آدمی اپنے اندر سے اٹھے والی کیفیات اور جذبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ نبی کریم جو دعوت لے کر آئے، جو پیغام آپ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، یہ دعوت اور یہ پیغام آپ کے لیے اتنا کھلا واضح اور روشن تھا کہ جیسے عام آدمی کے لیے دن میں آسمان پر چمکتا ہوا سورج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت اور جنت و دوزخ، یہ ساری چیزیں ہماری نظروں سے محو ہیں لیکن نبی کے لیے یہ ساری چیزیں غیب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔

نبی کو تو اللہ تعالیٰ براہ راست علم دیتا ہے۔ جس طرح دن کی روشنی میں ایک عام آدمی دیکھ سکتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اور یہ اس کے لیے ایک کھلی حقیقت ہوتی ہے، یہی کیفیت نبی کی اللہ اور آخرت کے بارے میں ہوتی ہے۔ اب اگر آدمی دن کے اجالے میں کھڑا ہو کر یہ کہے کہ لوگو! سورج نکلا ہوا ہے لیکن لوگ اس کھلی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، اس کے برعکس اس کو ملامت کریں، طعنے دیں کہ تم اندھے ہو گئے ہو، تم پر جادو کر دیا گیا ہے، تم شاعری کر رہے ہو، تم پر جنون ہو گیا ہے، اسی لیے تمہیں رات کے وقت سورج نظر آ رہا ہے، یا سورج نہیں نکلا ہوا اور تم کہہ رہے ہو کہ نکلا ہوا ہے۔ کسی نے تم کو چمکے دے دیا ہے یا باہر سے کوئی چیز تمہارے اوپر آگئی ہے، کوئی تمہارا استاد ہے جو تمہیں باتیں گھڑ گھڑ کر دیتا ہے وغیرہ۔ گویا نبی جو چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، دنیا اس کو جھٹلانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس موقع پر انسان جن کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، یا گزرتا ہے وہ نفسیاتی کیفیات کہلاتی ہیں۔

دعوت حق قبول نہ کرنے پر اضطراب

ایک نبی بھی اس نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ نبی کے لیے سب سے پہلی آزمائش یہی ہوتی ہے کہ جس حق کی دعوت لے کر وہ اٹھا ہے اس کو جھٹلایا جائے۔ یہ جھٹلانا معمولی جھٹلانا نہیں ہوتا۔ جو آدمی جانتا ہو کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں سچی اور برحق ہے، مگر اسے جھٹلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم بے وقوف ہو، تم جھوٹے ہو، تم کو دھوکا ہو گیا ہے، تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے، اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے وہ شدید غم اور حزن کی کیفیت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا غم ہوتا تھا کہ لوگ سچی بات کیوں نہیں مانتے، اور نہ صرف یہ کہ کھلی حقیقت کو جھٹلاتے ہیں بلکہ مذاق بھی اڑاتے ہیں اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے: لَا يَخْذُلُكَ فَوَلِّهُمْ (یونس ۱۰: ۶۵) ”اے نبی، جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں۔“

قرآن مجید میں کئی جگہ کہا گیا ہے: وَاضْبِرْ عَلٰی مَا يَقُولُوْنَ (المزمل ۴۳: ۱۰) ”جو کچھ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔“ اس لیے کہ سب سے بڑاقتنہ اور آزمائش تو لوگوں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ باتیں جو لوگوں کی زبان سے نکلتی ہیں، خواہ لوگ کان میں آ کر کہیں، مجلس میں بیٹھ کر کہیں، کتابوں میں لکھ کر چھپوائیں یا اخبار میں شائع کریں، یہ بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ کوڑے کی مار، پتھر کی چوٹ اور ریت پر گھسیٹا جانا شاید اتنی سخت آزمائش نہ ہوتی ہوگی، جتنی سخت آزمائش طنز، طعن و تشنیع اور مذاق و استہزا سے ہوتی ہے۔ یہ اندرونی چوٹ زخم کاری کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی زد آدمی کی عزت نفس، اس کی سچائی، اس کے کردار اور مقام و مرتبے پر بھی پڑتی ہے۔ یہ جسمانی چوٹ سے زیادہ گہری چوٹ ہوتی ہے۔ اسی پر قرآن نے کہا:

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ (المزمل ۷۳: ۱۰) جو کچھ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔

مایوسی و ناامیدی

اس غم اور حزن کو برداشت کرنا صبر ہے۔ اس سے آدمی مایوس بھی ہوتا ہے۔ اس مایوسی کا ذکر قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے۔ جو آدمی بات نہ مانے بار بار کہنے کے باوجود نہ مانے ہر قسم کی دلیل سننے کے باوجود بھی نہ مانے نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تسلیم نہ کرے اور پھر پہلی قوموں کا بھی ذکر ہوا ہے کہ برسوں دعوت کا کام ہو لیکن ان لوگوں نے مان کے نہیں دیا، تو پھر آدمی کے اوپر مایوسی طاری ہوتی ہے۔ مایوسی اندورنی کیفیت ہے اور غم کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے اور آدمی کے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ جب لوگ نہیں مانتے اور سچی بات کو جھٹلاتے ہیں تو آدمی کو اس سے دکھ ہوتا ہے جو مایوسی کا باعث بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حزن کا لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ اسی حزن سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مایوسی کا قرآن پاک نے بار بار علاج کیا اور اس کے لیے مختلف طرح سے تسلی دی اور حوصلہ دیا کہ اگر یہ لوگ نہیں مانتے ہیں تو یہ ان کی اپنی غلطی اور اپنا قصور ہے۔ آپؐ کا کام تو بس اتنا ہے کہ آپؐ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچادیں۔ زبردستی منوانا آپؐ کا کام نہیں ہے۔ ہم نے آپؐ کو دار و فہ بنا کر نہیں بھیجا ہے اور نہ ان کے سر پر مسلط کیا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا، ان کا اپنا اختیار ہے۔ آپؐ ان کے سامنے حق پیش کرتے رہیں جو قبول کرے گا وہ اپنی آزاد مرضی سے قبول کرے گا اور جو انکار کرے گا وہ اپنی آزاد مرضی سے انکار کرے گا۔ ان کا فیصلہ ہم نے آپؐ کے ہاتھ میں نہیں دیا ہے۔ اگر انھیں زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو کیا اللہ تعالیٰ کے پاس خود کم طاقت تھی۔ وہ یہ سب کام کیوں کرتا کہ نبیؐ کو بھیجتا، دعوت کا کام کروانا، کتاب اتارنا، اس کے لیے تو وہ ایک کلمہ کن کہتا اور سارے لوگ ایک ہی راستے پر آ جاتے: **وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً** (ہود: ۱۱۸) ”بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا“۔ سب اس کی بندگی کرتے“ سب فرشتوں کی طرح ہو جاتے۔ لیکن فرشتے تو پہلے سے موجود تھے۔ انسان کو تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے اختیار کے استعمال کی آزمائش ہو۔ وہ اپنے ارادے سے اور اپنے فیصلے سے راہ حق پر آئے۔ اس کے لازمی معنی ہیں کہ جو آدمی چاہے گا مانے گا اور جو نہیں چاہے گا نہیں مانے گا۔ لہذا تمہیں مایوسی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو باور کیا کہ اگر ایک داعی اس بات کو بخوبی جانتا ہو کہ اس کا کام تو احسن انداز میں لوگوں تک پہنچانا ہے اور اس کا ماننا نہ ماننا، قبول کرنا یا رد کرنا، لوگوں کا اپنا اختیار ہے اور وہ اس بات کا مکلف نہیں کہ لازماً لوگ حق بات کو تسلیم کریں، تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

ایک کیفیت آدمی پر یہ طاری ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ معاملہ جلدی سے نپٹ جائے جب کہ یہ جدوجہد ایک طویل جدوجہد ہے۔ یہ تو یقین ہوتا ہے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور اس کا دین غالب آئے گا۔ یہ اللہ کا اپنے رسولؐ سے بالکل حتمی و یقینی وعدہ ہے کہ تمہارا کام ضرور مکمل ہو کر رہے گا خواہ یہ تمہاری زندگی میں ہو یا موت کے بعد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اس دین کو ضرور غالب کر کے رہے گا۔ یہی وعدہ نبی کریمؐ کے ساتھ تھا اور آپؐ کی چالیسین امت مسلمانوں سے بھی ہے لیکن آدمی کی طبیعت میں عجلت پسندی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر کام جلد سے جلد ہو جائے۔ کافروں کے بارے میں عذاب کی جو دھمکی ہے وہ بھی ذرا جلد آجائے اور جس منزل کا وعدہ ہے کہ دین غالب ہوگا وہ بھی جلد سر ہو جائے۔ بسا اوقات نبی کریمؐ بھی پریشان ہو کر اس طرح سوچنے لگتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جلدی مت کرو۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوْتِ (القلم ۶۸:۳۸) ”اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ۔“ یہاں حضرت یونسؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب ان کی قوم نے برسوں دعوت کے کام کے بعد مان کے نہیں دیا تو وہ مایوس ہو گئے اور اسی جلد بازی کی وجہ سے بہستی چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی طرح نہ ہو جاؤ بلکہ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کے ساتھ دعوت کا کام کیے چلے جاؤ۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (الاحقاف ۳۶:۳۵) ”پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔“

جلد بازی صبر کے منافی ہے۔ جلد بازی مایوسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حزن سے مایوسی پیدا ہوتی ہے اور پھر مایوسی سے جلد بازی۔ اگر آدمی کو امید بندھی رہے کہ میرا کام ہو جائے گا اور ہو کر رہے گا اور اس کا وقت مقرر ہے تو پھر وہ اتنی جلد بازی نہیں کرے گا۔ جلد بازی آدمی تب کرتا ہے جب اس کو خود پر یقین نہ ہو اور مایوسی ہو۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ یہ کام اس طرح تو نہیں ہوگا کچھ اور کرنا چاہیے یا کوئی اور راہ نکالنی چاہیے۔ اسی کے نتیجے میں عجلت پسندی یا جلد بازی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تَسْتَعْجِلْهُ ط (النحل ۱:۱۶) ”ان کے بارے میں جلد بازی نہ کرو۔“ اس لیے کہ ہم نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا۔

خدا کی مدد اور وعدوں پر شک

اسی حزن و غم کے نتیجے میں جو اگلی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ وعدے بھی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیے ہیں۔ اللہ کے نبی تو اس کیفیت میں جتنا نہیں ہو سکتے لیکن یہ ضرور پکاراٹھتے

ہیں: مَنَى نَضْرُ اللّٰهُ (البقرة ۲: ۲۱۳) ”اللہ کی مدد کب آئے گی؟“ ان کو شک تو نہیں ہوتا لیکن اس بارے میں شبہ ہونے لگتا ہے کہ کبھی ہم منزل پر پہنچ بھی پائیں گے یا نہیں۔ اس بارے میں ہدایت یہ ہے فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (الروم ۳۰: ۲۰) ”یعنی صبر کرو راہ خدا پر جسے رہو اور اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ اس کا وعدہ باطل سچا ہے۔“

انسان کے لیے آخری خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چلا جائے اور مخالفین کے ساتھ ملنے کی کوشش کرے کہ وہ چھائے ہوئے ہیں، غالب ہیں اور انہی کا سکھ چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نبی کے بارے میں یہ خدشہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے، مگر نبی کو مخاطب کر کے نبی کے ماننے والوں کو ہدایت دینا مقصود ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ اِمْۤا اَوْ كُفُوۤا (الدھر ۷۶: ۲۳) ”تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں سے کسی بد عمل یا منکر حق کی بات نہ مانو“۔ گویا اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو اور اس کے لیے صبر کرو۔ یہاں انتظار کا لفظ استعمال نہیں ہوا، میں نے ترجمہ کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صبر کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔ اس کام میں لگے رہو اور جو غلط کاروں کا گروہ ہے، ان کے ساتھ ملنے کا مت سوچو۔ یہ کسی بے صبری کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ چیز صبر کے منافی ہے۔

خوف اور حزن کا علاج

اگر غور کیا جائے تو یہ سب نفسیاتی کیفیات حزن سے پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک چیز جو ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہو، مگر ہو جاتی ہے تو ہمیں اس کا غم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو چیز ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہو جائے اور نہ ہو تو ہمیں اس کا غم ہوتا ہے۔ اس غم سے مایوسی، کم حوصلگی اور پست ہمتی اور بہت ساری کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ جلد بازی اور بے یقینی کی ساری کیفیات بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہر ایک کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ اِصْبِرْۤا اِصْبِرْۤا ، یعنی صبر کرو اور اپنے کام پر جسے رہو اور صبر سے مدد چاہو اپنے آپ کو اس سے باندھ کر رکھو اپنے آپ کو ایک مقام پر روکے رکھو۔ اس لیے کہ یہی ان چیزوں کا علاج ہے۔

دوسری کیفیت خوف کی ہے۔ اس بات کا خوف کہ کل نہ جانے کیا ہو جائے۔ اسی طرح جان کا خوف ہوتا ہے، مال کے ضائع ہونے کا خوف ہوتا ہے اور دنیا کے اندر جو عزت اور وقار ہے اس کے چھن جانے کا خوف بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تمام خوف اور اندیشے انسان کے اوپر حاوی ہیں۔ زندگی آدھی تو حسرت کی نذر ہو جاتی ہے کہ کیا نہیں ہو سکا اور آدھی خوف کی نذر ہو جاتی ہے کہ نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ اس کا علاج بھی صبر ہے۔ چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ابتلا و آزمائش کا ذکر کیا، وہاں سب سے پہلے خوف کا ذکر کیا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّن

الْخَوْفِ (البقرة ۲: ۱۵۵)۔ اسی طرح دشمن کے حملہ آور ہو جانے اور مسلط ہو جانے کا خوف ہوتا ہے۔ دیگر ہزاروں اندیشے اور خطرات ہوتے ہیں جو آدمی پر طاری ہوتے ہیں۔ وہ لرزتا ہے، کانپتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہو جائے، رشتہ دار ساتھ چھوڑ دیں گے، دوست ساتھ نہ دیں گے اور پتا نہیں کیا کیا نقصان ہو جائے۔ فرمایا کہ اس خوف سے ہم آزمائیں گے۔ اس خوف کا علاج بھی صبر ہے۔ خوف کے مقابلے میں جیسے رہنا اور پیچھے نہ ہٹنا بھی صبر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کے راستے پر جتنے اور ہر طرح کی قربانی دینے کی بھی ہدایت کی ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کو باپ کے ذریعے حکم ملا کہ تمہاری جان مطلوب ہے تو انہوں نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ قَالَ يَا بَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصّٰفّٰت ۳: ۱۰۲) ”اس نے کہا ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“ یہ صبر عام قسم کا نہیں تھا بلکہ بڑے عزم اور حوصلے کا صبر تھا کہ میری جان حاضر ہے۔ اس کے لیے تیار ہوں۔ یہ اللہ پر توکل تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دین کے دوسرے احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد سب کے ساتھ صبر کا ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر عمل نہیں ہو سکتا۔

مخالفت پر رویہ

دعوت کی راہ میں بہت سی مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو چیزیں سبھی اور برداشت کی جاتی ہیں ان پر آدمی کو صدمہ اور غم ہوتا ہے۔ اس میں مخالفین کے ساتھ روش کے حوالے سے بھی صبر کی تاکید ہے۔ صبر کے کچھ ایسے پہلو ہیں جو عموماً ناکاہوں سے محو ہوجاتے ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم پر کوئی سختی کرنے کوئی نقصان پہنچائے تو تمہیں بھی اس کی اجازت ہے کہ جتنا اور جس طرح تم کو نقصان پہنچایا گیا ہے، تم بھی اس کو پہنچاؤ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَلَقَدْ صَبْرَٰتُمْ لَهٗوَ حٰخِیْرًا لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۱۲۶)

لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

وَلَمَنْ صَبْرًا وَغَفْرًا اِنَّ ذٰلِكَ لَمَنْ عَزَمَ الْاٰمُوْرَ ۝ (الشورى ۴۲: ۴۳)

البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفات بیان کی ہیں ان کے لیے جنت کا وعدہ کیا ہے جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں وہاں اس نے جن صفات کا ذکر کیا وہ یہ ہیں:

الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالصَّرَّآءِ وَالْكُلُوْبِ اِيْنِ الْغَيْظِ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط

(ال عمران ۱۳۳:۳) جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بد حال ہوں یا خوش حال جو غصے کو
 نبی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

خرچ کرنے کے لیے بھی حوصلے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک پہلو ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر
 یہ خوبیاں ہیں کہ برائی کو بھلائی سے دفع کرو۔ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ ایک جگہ ان لوگوں کا جو اللہ کی جنت
 میں جائیں گے یوں ذکر کیا: وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا
 رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (الرعد ۱۳:۲۲) ”ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ
 اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور
 پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں“۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: وَلَا تَسْتَوِ
 الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ ط اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ
 حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلْقَاهَا اِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۗ ج وَمَا يُلْقَاهَا اِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ ۝ (حم السجدة
 ۳۱:۳۳-۳۵) ”نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ
 تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگہری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان
 لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبیہ والے ہیں“۔ گویا اخلاق کے
 اعلیٰ مقام تک وہی پہنچتے ہیں جو برائی کا جواب بھی بھلائی سے دیتے ہیں۔ برائی کو تو وہی چیز مٹا سکتی ہے جو بھلی اور
 اچھی ہو۔

جسمانی مصائب اور موت کا خوف

یہ وہ مختلف نفسیاتی کیفیات ہیں جو صبر کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس کے بعد پھر جسمانی مصائب اور جسمانی
 تکالیف ہیں۔ اگر اس حوالے سے بھی آدمی کا تصور واضح ہو تو وہ ہر طرح کے ظلم و جبر کو برداشت کر سکتا ہے، حتیٰ کہ
 جان بھی دینا پڑے تو بے خوف جان دے گا۔ جب یہ بات واضح ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے لہذا موت کوئی
 ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ اس چیز سے کیا ڈرنا جس کا نہ تو وقت معلوم ہو نہ جسے روکا جاسکتا ہو نہ اس سے بچا جا
 سکتا ہو نہ اس کو ٹالا جاسکتا ہو اور نہ اس سے چھپ کر کہیں جایا جاسکتا ہو اور نہ ایک گھڑی آگے کی جاسکتی ہو اور نہ
 پیچھے۔ بہت بے وقوفی ہے کہ آدمی اس سے ڈرے۔ ڈرنا تو اس چیز سے چاہیے کہ جو اس کے بعد پیش آنے والی
 ہے جسے ٹالا جاسکتا ہے جس سے بچا جاسکتا ہے اور کچھ کر کے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے، یعنی آخرت۔ لہذا جس کو یہ
 معلوم ہو کہ موت کا وقت مقرر ہے تو پھر اس کو کبھی بھی موت کا خوف لاحق نہیں ہو سکتا۔

حضرت علیؑ کا مشہور قول ہے کہ دو دن ایسے ہیں کہ جب میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ایک دن تو وہ ہے کہ

جس روز موت کو نہیں آتا۔ اس دن موت سے ڈرنے کی کیا ضرورت! اس لیے کہ اس روز تو اس کو نہیں آتا۔ دوسرا دن وہ ہے جس دن موت کو آتا ہے۔ اس دن بھی موت سے کیا ڈرنا کہ اس دن ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں یہ بات کہی ہے کہ یا تو آج کے دن موت کو آتا ہے یا آج کے دن موت کو نہیں آتا۔ اگر آج کے دن موت کو آتا ہے تو ٹل نہیں سکتی لہذا ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر موت کو اس روز نہیں آتا تو خواہ مخواہ آدمی کیوں ڈرنے۔ یہ تصور موت سے بے خوف کر دیتا ہے اور آدمی کے اندر صبر و ہمت پیدا کر دیتا ہے۔ پھر وہ عزم اور حوصلے کے ساتھ جمار ہوتا ہے۔

صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف چند پہلو سامنے رکھے ہیں۔ قرآن مجید اسے کہیں صبر کے نام سے اور کہیں نام لیے بغیر صبر کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ کہیں اپنے نبیؐ سے خطاب کرتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی صبر کا سامان ہوتا ہے اور کسی نہ کسی خزانے کا منہ کھولتا ہے جہاں سے دعوت کا کام کرنے والا صبر کا خزانہ حاصل کرتا ہے۔ کوئی چشمہ ایسا بہتا ہے کہ جہاں سے کوئی فیض ملے۔ نبی کریمؐ اور آپؐ کے ساتھی جس طرح اپنے مقام پر اپنے موقف پر اپنے کام اور اپنے مقصد کے اوپر چلے رہے وہ اسی صبر کا نتیجہ تھا اور بالآخر ساری دنیا کے وارث بن گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے صرف فلسطین عطا کیا تھا، لیکن حضورؐ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک پوری دنیا صبر کی وجہ سے عطا کر دی۔ یہ صبر کا نتیجہ تھا اور وہ صبر کے مقابلے میں کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

صبر اور ذرائع قوت

صبر کا سرچشمہ دراصل یہ احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز قائم ہے اور ہم ہر وقت اللہ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں سورہ مدثر میں سورہ اقرآ کے بعد دوسری یا تیسری وحی میں یہی ہدایت فرمائی: **وَلِيْرَتِكَ فَاَصْبِرْ ۝ (المحدثر ۷۳: ۷۷)** ”اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو“۔ گویا اپنے رب کی خاطر اور اپنے رب کے لیے جم جاؤ اور یہ سمجھو کہ میں اپنے رب کے لیے کام کر رہا ہوں، رب کا کام کر رہا ہوں اور رب کی راہ میں ہوں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ قرآن پاک نے اس طرح بار بار صبر کی تلقین کی ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ (الطور ۵۲: ۴۸) اے نبیؐ، اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کے دربار میں بھیجا تو انھوں نے کہا کہ ہم فرعون کے دربار میں جائیں گے

لیکن میرے اوپر خون کا دعویٰ بھی ہے اور مجھے ڈر اور خوف بھی ہے۔ اس پر فرمایا: اِذْخِي مَعَكُمْ مَا اَسْمَعُ وَاَنْزِي (طہ: ۲۰) ”ڈرومت‘ میں تمہارے ساتھ ہوں‘ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں“۔ گویا تم جس حال میں بھی ہو گئے‘ میں سن بھی رہا ہوں گا اور دیکھ بھی رہا ہوں گا۔

دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات صبر کا سرچشمہ ہے۔ جب آدمی کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے‘ کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں ہے۔ یہ دین بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ لوگوں کو دین کی راہ پر لانا‘ ان کے دلوں کو حق کی طرف موڑنا‘ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو ہوگا‘ اور اگر نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگا۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ ۲: ۱۵۶) ”ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ دراصل وہ چھوٹا سا کلمہ ہے جس کے اندر صبر کی ساری دنیا پنہاں ہے۔ اسی لیے حادثے اور صدمے پر اسی کو پڑھا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس سے آدمی صبر حاصل کر سکتا ہے۔ گویا کوئی چیز میری اپنی نہیں ہے‘ اللہ کی ہے۔ سب چیزوں کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اس کا انجام وہیں پر ہوتا ہے۔

اسی طرح نماز کو صبر کے ساتھ اس لیے جوڑا گیا ہے کہ نماز میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے الفاظ ہیں اَسْتَعِينُوْا بِاللّٰهِ ، ”اللہ سے مدد مانگو“۔ اور وہی الفاظ پھر ہیں کہ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ كدائے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد مانگو۔ صبر کا لفظ انہوں نے خود کہا۔ اللہ کی مدد کے لیے صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے کہ صلوٰۃ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا نام ہے۔ اللہ کے سامنے حاضر ہونے‘ اللہ سے بات چیت اور اللہ سے قرب کا نام ہے۔ سجدہ کرتے وقت آدمی اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ جب اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو نماز اللہ کی یاد اور اللہ کے قرب کا نام ہے‘ نیز نماز صبر کا سامان فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے:

اَسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ ۲: ۱۵۳) صبر اور نماز سے مدد لو۔

فَاَصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝
وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَذْبَانَ الشُّجُوْدِ ۝ (ق: ۵۰-۳۹) پس اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ
بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب
آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریز یوں سے فارغ ہونے کے بعد
بھی۔

وَأذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝
 (الدھر ۷۶: ۲۵-۲۶) اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کر ڈرات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور
 رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

جہاں بھی صبر کا ذکر آئے گا وہاں سے کسی نہ کسی پہلو سے اللہ کا اس کی حمد کا اور نماز کا ذکر آئے گا۔ اس لیے
 کہ صبر کی پوری استعداد اسی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ جتنا یہ تعلق مضبوط ہوگا، یقین مضبوط ہوگا، اتنا ہی آدمی بے
 خوف اور اللہ سے ملاقات کا شائق ہوگا۔ کوئی چیز جو اللہ کی ہے اگر اس نے لے لی تو اس پر کوئی گلہ نہیں ہوگا، کوئی
 صدمہ نہیں ہوگا۔ اللہ کی عزت اس کی عزت ہے اور اس کی عزت اللہ کی عزت ہے۔ اسی کی خاطر وہ جمار ہے گا۔
 لہذا اس کو کسی بات کا صدمہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے سے بڑا صدمہ تو جان کے ضیاع کا ہوتا ہے، اگر جان کا ضیاع بھی ہو
 جائے تو یہ ہمارے ہاں بہت معروف ہے اور کہا جاتا ہے: لِيْلَهُ مَا آخَذَ وَلِيْلَهُ مَا عَطَا، جو لے لیا وہ بھی اسی کا
 تھا، جو دیا ہے وہ بھی اللہ کا ہے۔ کوئی چیز ہماری نہیں ہے، سب کچھ اسی کا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ
 اس کی بھر پور عکاسی کرتا ہے۔ گویا سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے، سب اسی کی ملکیت ہے، ہمارے پاس تو ایک امانت
 ہے۔

جب نماز سے اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے اللہ کی یاد دل میں بہتی ہے، ڈیرے ڈالتی ہے، تو پھر صبر پیدا
 ہوتا ہے۔ اللہ کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نماز کو خشوع کے ساتھ پڑھنے کے لیے بڑے
 صبر کی ضرورت ہے۔ اس لیے بھی دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔
 نماز ٹھیک ہو تو صبر پیدا ہوتا ہے اور نماز ٹھیک سے پڑھنے کے لیے صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہزاروں خیالات
 آتے ہیں، ہزاروں وسوسے پریشان کرتے ہیں، ان کے اوپر قابو پانا اور ان کے مقابلے میں اللہ کو یاد رکھنا، اس کے
 لیے بڑے ضبط اور بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ حصول صبر کے لیے ایک جامع نسخہ ذیل کی آیات میں بیان کیا
 گیا ہے:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ط وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ
 يَخْلُقُونَ أَنفُسَهُمْ مَلَقُوا رَبَّهُمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ۝ (البقرة ۲: ۳۵-۳۶) صبر اور نماز سے
 مدد لو، بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں برداروں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں
 کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

گویا صبر اور نماز سے مدد مانگی جائے اور یہ مدد مانگنا بڑا مشکل ہے، سوائے ان کے جو خشوع کی کیفیت
 رکھتے ہیں، جن کے دل اللہ کے آگے پست ہیں، یا جن کے دل اللہ کے ذکر سے کھل جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں

جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں، جن کو اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اللہ سے ملاقات کرنی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، یعنی ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے کے اندر پورے صبر کا نسخہ آ گیا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمیں اس اعلیٰ اخلاقی مقام پر پہنچائے اور اس کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

(کتابچہ دستیاب ہے۔ منشورات، منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ قیمت: ۶ روپے)

ماہنامہ ترجمان القرآن نومبر ۲۰۰۶ء